توازن واعتدال کا شاعر۔۔۔احمد حسین مجاہد

(رؤف امیر)

احمد حسین مجاہد کا ایک شعر پچھلے کئی دنوں سے میرا وظیفہ ہے:

مدت گزر گئی ہے اِس حال میں کہ میرے
اک ہاتھ میں دیا ہے، اک ہاتھ ہے دیے پر

ہمارے ہاں محروم طبقوں کو زندگی گزارنے کے لیے یہی کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن مجھے یہ شعر مجاہد کی تخلیقی زندگی کا استعارہ دکھائی دیا۔اس میں ایک شخص کی تصویر ہے جو دھند میں لپٹے جنگل میں راستہ بنانے کی سعی کرتا ہے۔چاروں جانب گھپ اندھیرا ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا لیکن پھر بھی اس ''مردِ مجاہد'' نے ایک ہاتھ میں دیا تھام رکھا ہے اور دوسرے سے اسے ڈھانپے ہوئے ہے۔

بالاکوٹ جیسے دور دراز علاقے میں احمد حسین مجاہد نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنے سخن کا چراغ روشن رکھا۔اس کے دیے کی روشنی مجھ تک بھی پہنچی۔احمد حسین مجاہد تنقید اور شاعری دونوں میں اپنی شناخت بنا چکا ہے۔تنقید میں وہ کبھی عروض کے مسائل پر قلم اٹھاتا ہے، کبھی مختلف اصناف کے خدوخال نمایاں کرتا ہے، کبھی عصری ادبی مباحث پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔لہٰذا ہمارا یہ ''مضافاتی'' نقاد مرکزی ادیبوں کے لیے غیر معروف نہیں ہے۔

شاعری میں وہ بدلتے ہوئے رنگوں اور ذائقوں سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور نئے رنگ، نئے ذائقے کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔سب سے پہلے مجاہد کی غزلوں میں سے ایک ایک مصرع اور ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

ع۔زمانہ دیکھ چکا ہے زمانہ دیکھے گا

ع۔پہلا مکالمہ ہے یہ میرا سکوت سے

اِس بار بھی شکست مرے وہم کی ہوئی
اِس بار بھی وہ میرے بلانے پہ آ گیا

اور

ذرا سی بات حائل ہے ہمارے درمیاں احمد
ذرا سی بات کے پیچھے مگر اک واقعہ بھی ہے

احمد حسین مجاہد کی غزلوں کے بیشتر اشعار اسی ہنر کے آئینہ دار ہیں۔وہ صاف، سیدھا، واضح، راست اور بے عیب مصرع کہنے میں کمال رکھتا ہے۔اسی کو ہماری روایتی تنقید ''بندش کی چستی'' سے تعبیر کرتی ہے۔اسی ''راست گوئی'' کا اثر ہے کہ مجاہد کے ہاں تراکیب کا

استعمال کم کم ہے لیکن بعض جگہوں پر اُس نے مرکب تراکیب کے باوجود اپنے براہِ راست اظہار میں کوئی جھول نہ آنے دیا مثلاً تشکیلِ خدوخالِ انا، نشاطِ الم نواز، جاگیرِ حرفِ حق، مرہونِ لطفِ آسماں، اور کاروبارِ اوجِ وعداوت وغیرہ۔ مزید یہ کہ یہ تراکیب اُس نے خلق ہی نہیں کیں ان کی تازگی بھی بے مثل ہے۔

اُس نے تین کم پچاس غزلیں شاملِ کتاب کیں اور ترتیب میں یہ قرینہ رکھا کہ غزلوں کو سات حصوں میں تقسیم کیا، جن میں پانچ حصے سات سات اور دو حصے چھ چھ غزلوں پر مشتمل ہیں۔ قرینہ در قرینہ یہ کہ ہر حصے کی غزلیں اپنی اندرونی ترتیب میں بلحاظ بحر بہت کم ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ یوں بحور کو کتاب میں پھیلا دیا گیا ہے۔ یہ تجربہ کسی کیاری میں جدا جدا رنگوں کے پھول کھلانے سے مشابہ ہے۔ اِس طرح مجاہد کی بحور کا تنوع بھی سامنے آتا ہے۔ سینتالیس غزلوں کے لیے بیس کے لگ بھگ بحروں کا انتخاب حیران کن ہے۔ مزید یہ کہ رباعی کے وزن میں غزل کہہ کر اُس نے اپنے فن کی دھاک بٹھائی ہے۔ میرا اشارا صفحہ سڑسٹھ کی اس غزل کی طرف ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

یوں اُس نے کیا دردسے دوچار مجھے

مجاہد کی ردیفیں بھی اپنے اندر جداگانہ شان رکھتی ہیں۔ وہ طویل ردیفوں کا شاعر نہیں۔ نہ ہی چمکتی اور کھنکتی ہوئی ردیفیں لانے کا شوق اسے دامن گیر ہے۔ اس کی ردیفیں شوخ نہیں سادہ ہیں لیکن یہ سادگی بھی پرکاری سے عاری نہیں۔ وہ زیادہ تر یک لفظی یا دولفظی ردیفیں لاتا ہے۔ کبھی کبھی تین لفظوں تک سلطنتِ شعر کو وسعت دے لیتا ہے لیکن ایسا خال خال ہی ہوتا ہے۔ ایک نجی محفل میں احمد فراز نے کہا تھا کہ ردیف کے بغیر کامیاب غزل کہنا مشکل ترین کام ہے۔ احمد حسین مجاہد نے فقط ایک غزل غیر مردف کہی لیکن کمال کر دکھایا۔

مجاہد کی یک لفظی ردیفوں میں ''اللہ'' اور ''سائیں'' بہت متاثر کن ہیں جب کہ دولفظی ردیفوں میں ''خیال کے نثار، کمال کے نثار'' پر جان و دل نثار کرنے کو دل کرتا ہے جب کہ ''معاملات سے گریز، ذات سے گریز'' سے گریز اں نہیں گزرا جا سکتا۔ ''کائناتِ تنہائی، معجزاتِ تنہائی'' میں ردیف کو اضافت کے ذریعے قافیے کا حصہ بنا کر مہارت سے عیبِ تنافر کو دور کیا گیا ہے۔ یہی نہیں احمد حسین مجاہد کے قوافی کا استعمال بھی صناعانہ ہے جیسے ''الف'' کے قافیے کی ایک غزل کا مصرع ہے:

ع۔ جو زندگی کو گزر رے ذرا ذرا کر کے

قافیے کے ضمن میں اگر میں ''دیے'' والی غزل کی داد نہ دوں جس کا ایک شعر آغاز میں دیا گیا ہے تو حق ادا نہیں ہوگا۔ یہاں ''دیے'' کے قوافی ''ثاپیے، لیے، کیے وغیرہ لائے گئے ہیں جو مجاہد کی فن سے آشنائی کی ارفع مثال ہیں۔ عام درجے کا شاعر یہاں قافیے کو رواں کر لیتا لیکن مجاہد کے نزدیک فن پر کوئی سمجھوتا کرنا نا قابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ صوتی حوالے سے اتنے مضبوط ''قافیے'' مجاہد ہی سے متوقع تھے۔ صد شکر اس نے توقعات کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

ردیف اور قافیہ نبھانے کی بات ہمارے نقادوں کے ہاں شدومد سے سنائی دیتی ہے۔ مجاہد کی غزل میں اس نوع کی مثالیں کم نہیں لیکن میں ایک شعر سے بہت محظوظ ہوا۔ آپ کو بھی لذتِ سخن میں شامل کرتا ہوں:

انا کی سخت چٹانوں میں راستہ کر کے
کیا ہے ایک خلا ختم، دوسرا کر کے

احمد حسین مجاہد کی فنی تحسین ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں چاہتا ہوں کہ لفظ لفظ کو تصویر کر دوں لیکن اس طرح معاملہ طول پکڑ جائے گا۔ مجاہد کی غزل کے فنی تجزیے کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ توازن واعتدال کا شاعر ہے۔ مجاہد کی بحور متوازن ہیں، اس لبالب دریا کی طرح جو تیزی سے بہتا ہے لیکن کناروں سے چھلکتا نہیں۔ اس کی یک لفظی یا سہ لفظی ردیفیں اس کی بحور کو معتدل بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اس کے قوافی، تراکیب اور لفظیات جاذبِ نظر ضرور ہیں لیکن شوخ وشنگ نہیں۔ اس کے مصرعوں میں حشو وزوائد مفقود ہیں اور غزلوں کے اشعار میں انتہا کی تراشیدگی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سماجی رویوں میں مجاہد ضبط سے کام لیتا ہوگا۔

فکری اعتبار سے احمد حسین مجاہد کی غزل میں سیاسی وسماجی شعور مل تو جائے گا لیکن وہ اس نعرے بازی کی زد میں نہیں آیا۔ اس کا رجحان طبع دروں بینی کی طرف مائل ہے۔ اُس کی غزل کے نمایاں ترین رنگ حیرت اور عشق ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اِن رنگوں کی تفہیم کروں، مجاہد کی غزل کے ایک دھیمے مگر نمایاں پہلو کا ذکر ہو جائے۔

احمد حسین مجاہد کی غزل میں ''صوتِ ہزار'' کا یہ موسم دیکھ کر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ ایسے اشعار جن میں برف کا حوالہ ہے یا سخت چٹانوں کا ذکر ہے یا شبنمی پھولوں کی باتیں ہیں یا گونجتے جنگل کی کہانی ہے، ہزارے کے ترجمان ٹھہرتے ہیں۔ گو ایسی مثالیں کم ہیں لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی طور پر مجاہد کا رجحان دروں بینی کی طرف مائل ہے۔ کچھ شعروں میں علاقائی امیجری دیکھیے:

تھوڑی دیر کو برف پہ سورج چمکا تھا
دریا میری آنگن تک آ پہنچا تھا

اور

شبنمی دیے رکھ کر رات کی ہتھیلی پر
رات اور بھی مجھ کو بے قرار کرتی ہے

میں نے مجاہد کی غزل میں حیرت کا ذکر کیا ہے۔ حیرت علم کا پہلا زینہ بھی ہے اور آخری بھی۔ کبھی مجاہد ادراک وآگہی کی باتیں کرتا ہے اور کبھی وجدان وابلاغ کے مسائل چھیڑتا ہے۔ وہ بڑا خوش نصیب ہے ورنہ بابِ حیرت ہر کسی پر وا نہیں ہوتا۔ مجاہد کی غزل دانش ودانائی میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ ہمیں وہ کچھ دکھاتی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ اس مقام پر مجاہد میں صوفیانہ روح حلول کر جاتی ہے۔ اپنے اس رنگِ خاص کے حوالے سے مجاہد کی غزل آفاقیت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ آفاقیت کا راستہ ''دروں بینی'' سے ہو کر گزرتا ہے۔ دیکھیے ہمارے صوفی پر سکتہ طاری ہے:

خود آگہی کا گزرا ہے مجھ پر وہ حادثہ
سکتے میں ہیں ہر ایک سے میرے تعلقات

اور خود آ گہی کی اگلی منزل یہی ہو سکتی ہے:

دھند کے اُس پار کیا ہے اب بتا سکتا ہوں میں
زندگی گزری ہے میری ذات کے ادراک میں

احمد حسین مجاہد کی غزل میں اُس کا تصورِ عشق پوری وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔احمد حسین مجاہد کے عشق کا انداز بھی صوفیانہ ہے ،آفاقیت اور ماورائیت یہاں بھی موجود ہے۔یہ عشق وہ ہے جسے فنا نہیں اور جو ازل اور ابد کی حدوں پر محیط ہے۔فکر و فقر کے راستے کے راہرو کا تصورِ عشق کتنا اجلا،روشن ،طیب اور منور ہے،دو شعر دیکھیے:

معلوم کے ملال سے آگے کہیں ہے عشق
ہر چیز ایک وہم ہے لیکن یقیں ہے عشق
رکھ اِس میں مشتِ خاک قدم احتیاط سے
ارواح کے خمیر کی طیب زمیں ہے عشق

''دھند میں لپٹا جنگل'' کا شاعر احمد حسین مجاہد عشق کی طیب اور مطاہر سرزمین سے وابستہ ہے جبھی تو کسی کا نام لیتے ہوئے لہجے کو نعتیہ کر لیتا ہے۔

نعتیہ لہجے کے ساتھ ساتھ مجاہد کی غزل میں مطالعہ قرآن بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے:

ع۔قسم ہے عصر کی انسان ہے خسارے میں
ع۔دیکھے ہیں اپنے شانوں پہ اکثر خدا کے ہاتھ
ع۔پھیر دیتا ہے دنوں کو درمیان خوب و زشت

جیسے مصرعوں کے پس منظر میں آیاتِ قرآنی کی روشنی موجود ہے۔

احمد حسین مجاہد اپنے ایک ہاتھ میں دیا تھامے ،دوسرے سے اسے ڈھانپے ہوئے دھند میں لپٹے ہوئے جنگل سے نکل آیا ہے۔صاحبان بصیرت پر اس کے چراغ سخن کی جھلمل جھلمل کرتی کرنیں واضح ہیں۔واقعی روشن چراغوں کو زیادہ تر تک اوجھل نہیں رکھا جا سکتا۔